ملفوظاتی ادب بحیثیت اہم تاریخی ماخذ

شازیہ مختار، سینئر لیکچرر، کینیئر ڈ کالج، لاہور

Abstract

☆ This essay presents the evidence that religious elements dominated the early Urdu Literature and proceeds to discuss its impact on the literary traditions.

☆ The essay further highlights how religious feelings formed the basis of the development of Urdu Literature, and social issues were also intertwined within these writings.

☆ Evidence is offered to show that these social issues were ignored when the mainstreaming of history started and discusses its impact.

ادب کا تعلق معاشرے کے کسی خاص طبقے سے نہیں ہوتا۔ تخلیقیت خداداد ہوتی ہے جو کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والے کسی بھی فرد کے اندر موجود ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ اردو ادب میں صوفیائے اکرامؒ بادشاہوں، درباری شعراء اور عوام میں سے بھی تخلیق کار کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس سے ایک حقیقت یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ادب افرادِ معاشرہ کی اکثریت کے احساسات اور عوامل کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ اس طرح تاریخ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ادب کی مختلف اصناف میں شعوری یا غیر شعوری طور پر جگہ پالیتی ہے۔

اُردو ادب ایک مخصوص خطے کی پیداوار ہے جو اپنے اندر اس کے مہ و سال کے بیانات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ عصری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ادب کے اس منفرد افادی پہلو کو اجاگر کیا جائے تاکہ دیگر شعبہ ہائے علوم کی طرح ادب بھی انسانیت کے مفاد کی خدمت سرانجام دے سکے۔ برصغیر پاک و ہند میں روایتی تاریخ نویسی پر مختصر نظر ڈالنے سے بھی اس امر کی وضاحت ہوسکتی ہے کہ ادب کے اس افادی پہلو کو منظر عام پر لانا کیوں ضروری ہے۔

اس خطے کے قدیم دور میں ہندو علما اور مفکرین تارک الدنیا کے فلسفے کو اپنائے ہوئے تھے۔ اس عقیدے کے تحت وہ اس دنیا اور زندگی کو بے کار خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک گزر جانے والے لمحات اور وقائع حال اور مستقبل کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے اندر ماضی کا ریکارڈ رکھنے کا شوق اور شعور دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایلن فلیٹ اور اسپینگلر جیسے علمائے تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ ہند قدیم میں تاریخ نویسی کا کہیں وجود نہیں تھا۔

جب کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کے زریں اصولوں کے تحت اس صداقت کو بخوبی اپنایا اور نبھایا کہ ماضی کا حال اور مستقبل کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ ان کے سامنے سب سے بڑی دلیل کلام الٰہی (قرآن پاک) تھا۔ جس میں گزشتہ اقوام کے

حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد ساتھ ساتھ یہ درس بھی دیا گیا کہ یہ محض قصے کہانیاں نہیں بلکہ اس کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ان اعمال سے گریز کیا جائے جن کے باعث انسانیت تباہی و بربادی کا شکار ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم قوم نے ہمیشہ تاریخ کو اہمیت دی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی باقاعدہ ''تاریخ نویسی'' کی شہادتیں ملتی ہیں۔

برصغیر میں تصنیف کی جانے والی ابتدائی تواریخ عربی اور فارسی میں لکھی گئیں۔ ابتدائی مورخین صدر الدین محمد نیشا پوری (مؤلف تاج المآثر (۱۲۲۲ء) اور منہاج الدین جوزجانی (مؤلف طبقاتِ ناصری ۱۲۶۸ء) ایرانی تاریخ نویسی کی طرز کو اپنائے ہوئے تھے جب کہ امیر خسرو دہلوی (مؤلف تاریخ علائی ۱۳۲۱ء) اور ضیاء الدین برنی (مؤلف تاریخ فیروز شاہی ۱۳۶۸ء) مقامی ابتدائی مورخین میں سے تھے۔

سلاطین دہلی (جن کا سلسلہ قطب الدین ایبک ۱۲۱۲ء سے شروع ہو کر ظہیر الدین بابر ۱۵۴۲ء تک ہے) کے وقت میں بہت سی تاریخیں لکھی گئیں۔ بہت سی دیگر تصانیف میں سے ملاّ نظام الدین احمد کی ''طبقاتِ اکبری'' خاص اہمیت کی حامل ہے جس میں سبکتگین (۱۹۹۶ء) کے آغازِ حکومت سے لے کر اکبر (۱۶۰۵ء) تک کے حالات درج ہیں۔ ملاّ عبدالقادر بدایوانی کی ''منتخب التواریخ'' جس میں سلاطین غزنویہ (۹۹۰ء) سے لے کر اکبر تک کے احوال کو رقم کیا گیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف ''ذکر الملوک'' (جو ''تاریخ حقّی'' بھی کہلاتی ہے) میں شہاب الدین غوری سے آغاز کیا گیا ہے۔ حکیم محمد قاسم فرشتہ کی ''تاریخ فرشتہ'' میں اکبر کی وفات تک کے حالات و واقعات درج ہیں۔ اس تصنیف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صوفیا اور مشائخ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ منشی سبحان رائے کی ''خلاصۃ التواریخ'' میں قدیم ہندو راجوں سے لے کر اورنگ زیب کے دور تک کا بیان ملتا ہے۔

اُردو زبان اوّل اوّل ملفوظات میں ملتی ہے۔ چنانچہ دستیاب ملفوظاتی ادب میں ان عناصر کی نشاندہی کی جائے گی جو ''تاریخ'' تو ہیں مگر تاریخ نویسی میں جگہ حاصل نہ کر پائے۔ سیاسی اور معاشرتی تاریخوں کے علاوہ ان وقتوں میں تحریر کی گئیں دیگر تصانیف بھی تاریخی معلومات لئے ہوئے ہیں۔ اگر یوں کہا جائے کہ معاشرے کی تہذیبی' ثقافتی اور معاشرتی تاریخ انہی تصانیف میں زیادہ تفصیل سے ملتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ دورِ جدید کا مورخ اور محقق جب واقعات کی زیادہ سے زیادہ وجوہات کو کھوجتا ہے تو اپنے مقصد کے حصول کے لیے اسے یقیناً روایتی تواریخ کے علاوہ دیگر تحاریر سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ دیگر تصانیف میں سے بھی اس محققانہ ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بہتر سے بہتر کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں ادبی تصانیف ہی اس کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ کیوں کہ ادیب اور شاعر معاشرے کے نبض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ادب کی وہ اصناف (نثر) شہادت (گواہی) رکھنے والے نے خود تحریر کیں یا اس سے براہ راست سن کر کسی نے لکھیں وہ ''اورل ہسٹری'' کی اصطلاح کے تحت آتی ہیں۔ چنانچہ اس میں سب سے پہلے اردو ادب کی اس صنف کا ذکر آئے گا جس نے اُردو کی ابتدائی نشوونما میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ اس سے مراد ''صوفیانہ ادب'' ہے جو ہر صوفی بزرگ کے دور میں ان کے مریدین اور معتقدین نے مرتب کیا۔ اس کو ملفوظاتی ادب بھی کہا جاتا ہے۔

زبانوں کی ابتدا کو کسی مخصوص علاقے یا ایک حتمی نظریے کے تحت پابند نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیب و ثقافت کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان کے وجود میں آنے' بڑھنے' پھلنے پھولنے کا عمل صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ ایسے میں محققین اپنی اپنی تحقیق

کے تحت حاصل ہونے والے نتائج کو ہی حتمی صداقت سمجھتے ہیں۔ اس کے لیے ہر طرح کے دلائل اور ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ یہی صورت حال اردو کے ساتھ بھی ہے۔ لسانی تحقیق کے مقامی و غیر مقامی لسانی محققین نے اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے۔ قابل قدر محققین نے اپنی تحقیق کی روشنی میں اس کی ابتدا کو کبھی پنجاب کبھی دکن اور کبھی شمالی ہند سے ملایا' یہ سب لوگ اس کی ابتدا کو کہیں سے بھی تسلیم کریں مگر ایک رائے پر سب متفق ہیں کہ برصغیر میں اردو کی پیدائش کا عمل مسلم فاتحین کی آمد کے بعد شروع ہوا۔ غیر ملکی فاتحین اپنے ساتھ عربی' فارسی اور ترکی زبانیں لے کر آئے۔ ان زبانوں کے ساتھ مقامی زبانوں کے اختلاط نے صدیوں کی مسافت طے کر کے اردو زبان کی شکل اختیار کی۔ انہی وجوہات کی بنا پر اس زبان کو خالصتاً مسلم قوم کی زبان کہا گیا۔ اردو کی پیدائش اور نشوونما میں معاشرے کے تین طبقات کا کردار اہم ہے۔ ان میں سب سے پہلے صوفیا کرام کا نام آتا ہے اس کے بعد افواج اور تیسرا نمایاں طبقہ تجارت پیشہ افراد کا ہے۔ ان تین طبقات میں زیادہ تر افراد دوسرے ممالک سے تعلق رکھتے تھے (ایران' عراق' افغانستان' ترکی) وہ اپنے ساتھ اپنی زبانیں بھی لائے۔ ہندوستان میں مقامی لوگوں کے ساتھ بول چال' باہمی معاملات اور تعلیم و تربیت کی غرض سے مقامی زبانوں کی سمجھ بوجھ بھی حاصل کرنا پڑی۔ یوں بہت ساری زبانوں کے مل جانے سے اُردو کی بنیاد پڑی۔

تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی حکومت کی باقاعدہ داغ بیل پڑنے سے پہلے ہی یہاں اسلام کی روشنی پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ ان بزرگان دین نے اس خطے میں تبلیغ اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ مقامی لوگوں تک پیغام توحید کو پہنچانے کے لیے ان کی زبان پر عبور حاصل کیا۔ ان لوگوں نے اللہ کے دین کی خاطر نہ صرف مقامی زبانوں پر عبور حاصل کیا بلکہ ان میں مذہبی تصانیف بھی تخلیق کیں۔ ان ابتدائی تصانیف میں باہر سے آنے والے بزرگان دین اور مقامی افراد کی بولیوں کے مشترکہ اوصاف موجود تھے۔

یہ مشترکہ اوصاف والی زبان اردو ہی تھی جس کو اوّل اوّل ادبی درجہ دینے والے یہی لوگ تھے۔ ورنہ اس مخلوط زبان کو لشکری زبان کہا جاتا تھا اور اس میں ادبی تخلیقات تو درکنار' عام لوگ خط و کتابت کرنا بھی ضعفِ علمی کی دلیل سمجھتے تھے۔ مذہبی محافل و مجالس میں چونکہ اکثریت عام لوگوں کی ہوتی تھی اس لیے صوفیا عام فہم زبان کا استعمال ہی مناسب خیال کرتے تھے۔ جوں جوں ان محترم ہستیوں کا حلقہ عقیدت وسیع ہوتا گیا۔ ان کے مریدین میں ایسے لوگ بھی شامل ہوتے گئے جنہوں نے اپنے پیر و مرشد کے اقوال و ارشادات کو مرتب کرنے کا اہتمام کیا۔ ان کے پیش نظر یہ بات بھی اہم تھی کہ استاد محترم جس زبان میں بات کریں' جو الفاظ استعمال کریں ان کو من و عن محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ گیارہویں صدی عیسوی کی مذہبی تصانیف میں اردو زبان کی نوزائیدہ صورت نظر آتی ہے۔ یہ دور محمود غزنوی کا تھا اور زبان پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔ ممتاز صوفی حکیم سنائی (جن کا انتقال بارہویں صدی میں ہوا) کے کلام میں ہندی یعنی قدیم اردو کے الفاظ ملتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق اُردو کا وجود شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی کے زمانے سے ملتا ہے۔ وہ تصانیف بھی ''ملفوظات'' ہی ہیں۔ پہلے ''ملفوظ'' کی تعریف بیان کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں:

> ''ملفوظ صوفیا کرام کی اس بات کو کہتے ہیں جو وہ احباب اور مریدوں کی مجلس میں کسی دینی یا عرفانی موضوع پر کرتے ہیں۔ جس طرح نبی کریم ﷺ کی خصوصی باتیں ''احادیث'' اور صحابہؓ کی باتیں ''اخبار''

کہلاتی ہیں۔ اسی طرح صوفیا کرام کی خصوصی گفتگو کے لیے ''ملفوظ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ جس طرح یادداشت کے ذریعے احادیث اور اخبار کو محفوظ کیا گیا۔ اسی طرح ملفوظات کے مجموعے بھی مرتب کئے گئے۔ جو ''ملفوظاتی ادب'' کہلاتے ہیں۔''[۱]

شرعی احکامات اور معرفت کی باتوں پر مشتمل یہ ملفوظات اس دور کے لحاظ سے سادہ اور عام فہم تھے۔ کیوں کہ ان صوفیا یا مرتبین کے پیش نظر کوئی ادبی معرکہ سرانجام دینے کا مقصد نہیں تھا۔ بلکہ عام لوگوں تک ہدایت کی بات پہنچانا تھا۔ اس لیے ان کا اسلوب مقامی اصناف پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کی سادگی کا بھی نمونہ ہے۔ صداقت اور سادگی نے ہی انہیں پُر تاثیر بنایا ہے۔

''ملفوظات کو مرتب کرنے کا سلسلہ امیر حسن علاء سجزی سے شروع ہوتا ہے۔ ۲۸ جنوری ۱۳۰۸ء بمطابق ۳ شعبان ۷۰۷ ہجری کے ایک مبارک دن امیر حسن اپنے پیرومرشد کی محفل میں بیٹھے بیٹھے ایک فیصلہ کرتے ہیں کہ کیوں ناں شیخ کے اقوال اور ارشادات کو محفوظ کرلیا جائے۔ حکم ربی سے ان کے اس فیصلے سے زبان و ادب کو بھی ''ملفوظ'' کی شکل میں نئی صنف مل گئی۔ یہ ریت شروع ہونے کی دیر تھی کہ پورے برصغیر میں ملفوظات کو مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ اسی دور کے صاحب طریقت جناب علی بن محمود نے سلطان المشائخ کے اقوال کو ''درر نظامی'' کے نام سے محفوظ کیا۔ حمید قلندر نے حضرت خواجہ نصیر الدین محمود کے ملفوظات کو ''خیر المجالس'' کے عنوان سے ترتیب دیا۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے ہونہار فرزند سید محمد اکبر حسینی نے ان کے اقوال کو ''جوامع الکلم'' کے عنوان سے ترتیب دیا۔ جو اس دور کے بہت سے سیاسی اور سماجی حقائق کی معلومات کے باعث تاریخی حوالے سے بھی اہم ہیں۔ محمود بن سعد ابرجی نے شیخ احمد کھٹو گنج بخش کے ملفوظات مرتب کیے۔

برصغیر کی قدیم بزرگ ہستیوں کے اس قسم کے صدہا مجموعے موجود ہیں۔ اس زمانے کی روایت کے مطابق یہ مجموعے فارسی زبان میں ہیں۔ مگر مقامی اثرات کے باعث ان میں ہندی (قدیم اردو) کے فقرے دوہے اور اقوال وغیرہ موجود ہیں۔ جن کی بنا پر انہیں اُردو کے ابتدائی نقوش کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ بہاء الدین زکریا کے وقت سے قدیم اُردو کا تحریر میں شامل ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ اسی دور میں خواجہ معین الدین چشتی ؒ نے اپنے پیرو مرشد کے اقوال کو ''انیس الارواح'' کے نام سے مرتب کیا۔ خواجہ بختیار الدین کاکیؒ نے اپنے مرشد خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ارشادات کو ''دلیل العارفین'' کے نام سے خواجہ فرید الدین شکر گنج نے اپنے مرشد خواجہ بختیار الدین کاکیؒ کے ارشادات کے ''فوائد السالکین'' کے نام سے محفوظ کیا۔ خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے دو خلفاء حضرت نظام الدین االولیاء اور بدر اسحاق نے ان کے اقوال و ارشادات کو بالترتیب ''راحت القلوب'' اور ''اسرار اولیا'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی مجالس کی نعمتوں کو امیر خسرو اور امیر حسن سنجری نے ''فوائد الفواد'' اور ''راحت المحبّین'' کے نام سے سمیٹا۔ احمد برنی نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظات کو ''خزانۂ جلالی'' اور ''سراج الہدایت'' کے نام سے مرتب کیا۔ چشتیہ سلسلے کے دیگر کئی صوفیا کے اقوال سید محمد مبارک کی ''سیر الاولیا'' اور شیخ جمالی کی ''سید العارفین'' میں جمع ہیں۔ امیر خسرو کے نام سے ایک اور ملفوظات کا مجوعہ ''افضل الفوائد'' کے نام سے ہے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے ملفوظات ''خیر المجالس'' میں ان کے مرید حمید شاعر قلندر نے جمع کئے۔ برہان الدین غریب کے تین مجموعۂ ملفوظات ہیں۔ جو کہ ''حصول الحصول'' مرتبہ رکن الدین کاشانی ''ہدایت القلوب'' مرتبہ شیخ حسین

اور ''نفائس الانفاس'' مرتبہ خواجہ رکن الدین ہیں۔

انہی بزرگان دین کے باعث ابتدائی ہندی زبان مذہبی موضوعات کی معلومات کا خزانہ بنی۔ انہوں نے اس زبان میں دین، شرع، فقہ، قرآن، حدیث، تصوّف معرفت اور اخلاق وغیرہ کے مضامین کے لیے استعمال کر کے اس لسانی ناانصافی کو بھی دور کیا جو اس زبان کے عوامی ہونے کے باعث اس کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ سنسکرت اور پراکرت جیسی زبانوں کے حامل افراد معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عوام کی پہنچ سے ان زبانوں کو دور رکھنے کی باقاعدہ حکمت عملی اختیار کی جاتی تھی تاکہ اس طبقے کی بالادستی قائم رہے۔ صوفیا کرام نے جب عوام کی زبانوں کو فروغ دے کر نہ صرف انسان پر انسان کی بالادستی کی بیخ کنی کی بلکہ ایک زبان پر دوسری زبان کی فوقیت جیسی سماجی ناانصافی سے بھی نجات دلائی۔ ان کی اس عملی خدمت سے برصغیر میں لسانی اور ادبی سطح پر مثبت تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ خاص طور پر ہندو برہمن اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ دیوی دیوتاؤں کی زبان (سنسکرت) کو عام لوگ سنیں، پڑھیں یا سمجھیں۔ معاشرے کا مذہبی، سیاسی اور سماجی نظام انہی برہمنوں کے تسلط میں تھا۔ اپنی بالادستی قائم رکھنے کی خاطر انہوں نے ہر شعبے میں عوام کی حوصلہ شکنی کی۔ جب کہ صوفیا کی خانقاہوں کے دروازے بلاتخصیص مذہب و نسل کھلے تھے۔ اسی محبت اور حوصلہ افزائی کے باعث یہ خطہ اسلام کی روشنی سے منور ہوا۔

ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے نورِ باطن سے اہل ہند کے دلوں کو منور کرنے والے ان اولیا نے اس خطے میں بہت سے بادشاہوں کو بھی صراطِ مستقیم پر چلنے میں معاونت کی۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر حکمران ان فقیروں سے تعلق رکھنا باعث برکت سمجھتے رہے۔ تاریخ جہاں تک ہماری رہنمائی کرتی ہے اس سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ صوفیا کی آمد کا سلسلہ حضرت علی ہجویریؒ کی بابرکت ہستی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ غزنوی دور میں لاہور تشریف لائے۔ ''کشف المحجوب'' ان کی بابرکت تصنیف ہے۔ جس کے آج تک دنیا کی بڑی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ (۱۱۴۲ء تا ۱۲۳۵ء) راجہ پرتھوی راج کے دور میں اجمیر میں قیام پذیر ہوئے۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق ان دونوں بزرگوں کا کوئی ہندی قول یا شعر یا کوئی تخلیق موجود نہیں۔ اسی طرح بلند مرتبت صوفی حضرت نظام الدین اولیا (۱۲۴۶ء تا ۱۳۲۵ء) سے بھی ہندی منقول نہیں۔ مگر محققین کی اکثریت اس پر متفقہ رائے رکھتی ہے کہ ان شخصیات کی محافل و مجالس میں اسی زبان کا استعمال ہوتا رہا ہے کیوں کہ ان کا تخاطب عوام تھے اور عوام کی زبان ہندی (اردوئے قدیم) تھی۔ مبلغ اسی زبان میں تبلیغ کرتا ہے جو اس کے سننے والوں کو سمجھ آ سکے۔ حضرت خواجہ بختیار الدین کاکیؒ (۱۱۸۶ء سے ۱۲۳۶ء) قطب الدین ایبک کے زمانے میں دہلی تشریف لائے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ (وفات ۱۲۳۵ء) ولی ہند اور غریب نواز کے لقب سے مشہور ہیں۔

آپؒ سلسلۂ چشتیہ کے بانی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے پیرومرشد ہیں۔ ابتدائی محققین (مولوی عبدالحق) نے کوئی ہندوی قول ان سے منسوب نہیں کیا۔ مگر وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے یہ بزرگ ہندی نہ جانتے ہوں۔ شیخ محمد اکرم کی تحقیق کے مطابق آپ کا سفر ملتان اور پانچ سال تک قیام کا مقصد مقامی زبان کی تعلیم ہی تھی۔ شارح اکھروتی کے اس بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ تمام مبلغین حق مقامی ہندی زبان جانتے تھے۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ (۱۱۸۶ء سے ۱۲۳۶ء) خاندان غلاماں کے دور میں برصغیر تشریف لائے۔ ابوالفضل نے ''ائین اکبری'' اور غلام حسین طب طبائی نے ''سیر المتاخرین'' میں حضرت فرید الدینؒ نے کو فرخ شاہ کابلی کی نسل سے بتایا

ہے۔ تاریخ کی کتابوں کے مطابق آپ کے دادا چنگیز خاں کے فتنے کے دوران ہجرت کر کے لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کے تین بیٹے ان کے ہمراہ تھے۔ لاہور سے قصور اور قصور سے ملتان ہوتے ہوئے وہ یہاں کے ایک نواحی گاؤں کھوتوال میں آباد ہوئے۔ حضرت فریدالدینؒ وہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اس کے بعد حصول علم اور کسب فیض کے لیے دہلی اور ہانسی کے سفر کیے۔ ۶۹ سال کی عمر میں پنجاب کے ایک قصبہ ''پاک پتن'' میں سکونت اختیار کر لی۔ ان دنوں یہ قصبہ ''اجودھن'' کہلاتا تھا۔ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کی کوئی تصنیف صوفیانہ نظریات پر موجود نہیں مگر ان کے مریدین نے محافل و مجالس میں دیے جانے والے خطبات' اقوال اور ارشادات کو ملفوظات کو ''اسرار اولیاء'' کے نام سے محفوظ کر لیا۔ ان کو مرتب کرنے والے حضرت بدرالدین اسحٰق دہلوی تھے۔ ان کے قریبی زمانے میں ملفوظات و حالات پر مبنی کتب میں بابا فریدؒ کی رُباعیات' فقرے اور دوہے ملتے ہیں۔ جن سے ان کی ہندی زبان سے آگاہی کی شہادت بھی ملتی ہے۔ اگر وہ ہندی نہ جانتے تو مقامی لوگوں تک پیغام توحید نہ پہنچ پاتا۔ مقامی زبان سے بہت سے اقوال اور اشعار کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے تحقیق کی کہ ہندوستان میں شیخ الاسلام حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی اور فرید الدین گنج شکرؒ کے وقت سے اردوئے قدیم کا سراغ ملتا ہے۔

۱۲۳۴ء کا ایک رسالہ ''خلاصۃ العارفین'' میں حضرت زکریا ملتانیؒ کے ملفوظات بروایت حضرت جلال الدین بخاریؒ درج ہیں جو کہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے والد ماجد تھے۔ شیخ حمید الدین ناگوری (۱۱۹۳ء تا ۱۲۷۴ء) کے مجموعہ ملفوظات ''سرور الصدور'' میں ایسے مکالمات درج ہیں جن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ زبان جو آج ''اردو'' کہلاتی ہے' ہندی یا ہندوی کے طور پر ان بزرگوں کی بول چال میں تھی۔

شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ علاؤ الدین خلجی کے دور میں تھے۔ جو اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کر کے تخت و تاج پر قابض ہوا تھا۔ شیخ صاحبؒ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے امیر خسرو کو بھیجا جنہوں نے گا کر شیخ کا دل جیت لیا اور پھر شیخ صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ مولوی عبدالحق نے بوعلی قلندر کا یہ دوہا نقل کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بزرگ بھی اُردوئے قدیم سے واقفیت رکھتے تھے

سجن سکار لے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

اُردو کے ابتدائی دور کا ذکر امیر خسرو کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ ۱۲۵۵ء میں پٹیالی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام امیر سیف الدین تھا۔ وہ ماورا النہر (وسطی ایشیاء) سے چنگیز خان کے فتنے کے دوران ہجرت کر کے برصغیر آئے تھے۔ امیر خسروؒ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت مستند ہے کہ انہوں نے غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان محمد تغلق تک گیارہ شاہانِ دہلی کا زمانہ دیکھا۔ ان میں سے سات بادشاہوں کے درباروں کے ساتھ منسلک رہے۔ سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین سے کسبِ فیض کیا۔ وہ ان کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیک وقت کئی صلاحیتوں سے بہرہ مند کیا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں سپاہی، عالم، ولی کامل، شاعر اور ماہرِ موسیقی تھے۔ موسیقی کے کئی راگ، راگنیاں ان سے منسوب ہیں۔ وہ ہندی زبان میں باقاعدہ شاعری کرنے والے پہلے شاعر تھے۔ بیسوں پہیلیاں، انملیاں اور کہہ مکرنیاں ان کے نام سے مشہور ہیں۔ امیر خسروؒ کا ہندی کلام اگرچہ دست یاب نہیں مگر تذکروں میں ان کے نام

سے کلام مل جاتا ہے۔

ان کے کلام میں ہندی الفاظ کا بھرپور استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ اُردو کی باقاعدہ شاعری کا آغاز بھی امیر خسرو سے ہی ہوتا ہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ۱۲۶۳ء میں صوبہ بہار کے قصبہ منیر میں پیدا ہوئے۔ پُوربی اور ہندی میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے بتائے ہوئے منتر سانپ، بچھو کے کاٹے کے علاوہ دیگر امراض اور جھاڑ پھونک کے لیے بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔

سلطان محمد تغلق کے دور میں حضرت نظام الدین اولیاء کے خاص مریدین میں سے حضرت شاہ برہان الدین کا نام بھی قابلِ ذکر ہے جن کی روز مرہ بول چال میں ہندی زبان مستعمل ہے۔ حضرت گیسو دراز بندہ نواز کا اصل نام سید محمد ابن سید یوسف الحسنی دہلوی تھا۔ گیسو دراز اُن کا لقب تھا۔ صاحبِ علم وفضل تھے۔ آپ بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفا میں سے تھے۔ آپ اپنی دینی محافل میں مریدین کے ساتھ ہندی ہی میں تقریر فرمایا کرتے تھے۔ عربی اور فارسی کی بہت سی تصانیف ''حضرت'' کے ساتھ منسوب ہیں۔ ان کا ایک رسالہ جو عام لوگوں کی تلقین کے لیے تھا ''معراج العاشقین'' کے نام سے ہے۔ جو ابتدائی اردو کا نمونہ بھی ہے۔

صوفیا کے اس سلسلے کی ایک اور معتبر شخصیت خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا تعلق سمنان سے تھا۔ اسی نسبت سے ''سمنانی'' کہلائے۔ ان کے والد ''سمنان'' کے حاکم تھے۔ ان کی وفات کے بعد آپ کو مسندِ حکومت پر بٹھایا گیا مگر آپ کی طبیعت شروع سے ہی اس طرح کی دنیاداری کی طرف مائل نہ تھی۔ آپ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر تحصیلِ علم وفیض کے لیے برصغیر چلے آئے۔ سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے روحانی وعلمی فیوض حاصل کیے۔ اسی قیام (اوچ) کے دوران ہندی زبان بھی سیکھی۔ اس کے بعد دہلی تشریف لے آئے۔ جب آپ دہلی پہنچے تو مشہور صوفی بزرگ مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری کا وصال ہو چکا تھا۔ آپؒ کو ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔

خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اردو نثر کی سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف بھی انہی کے نام سے منسوب ہے۔ اخلاق وتصوف کے موضوع پر یہ رسالہ ۱۳۰۸ء کی تصنیف ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے وقت کے مشہور بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں خود مرتب کیا۔ بقول حامد حسن قادری:

> ''میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحے کی ہے اس کے صفحہ ۱۱۸ کی عبارت کا ٹکڑا یہ ہے۔
>
> ''اے طالب آسمان وزمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب خدا میں ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔''[۲]

اب تک کے محققین کی مشترکہ رائے کے مطابق دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو نظم میں اور سید اشرف جہانگیر سمنانی نثر میں اس کی باقاعدہ بنیاد رکھ چکے تھے۔ ''لطائف اشرفی'' جو سید صاحب کے ملفوظات پر مشتمل ہے اس میں ان کے ہندی سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے اور بھی بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔

ملفوظاتی ادب کے موضوع کے تحت جہاں مسلم صوفیا کا تذکرہ ضروری تھا۔ وہاں ایک ایسی شخصیت کا ذکر کرنا بھی

ضروری ہے جس کے غیر مسلم ہونے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ہے کبیر داس (۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۸ء) حامد حسن قادری نے ان کے بارے میں دو روایات درج کی ہیں:

> پہلی روایت یہ ہے کہ ''کبیر داس بنارس کے مسلمان جولاہے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ کسی برہمن کے لاوارث بچے تھے۔ ایک مسلمان جولاہے اور اس کی بیوی نے بیٹا بنا کر عالمِ شیرخوارگی سے پرورش کی۔''[۳]

اُردو کی نشوونما کی پہلی منزل صوفیا کے باعث ہی عبور ہوسکی۔ انہوں نے مقامی لوگوں سے ربط پیدا کرنے کے لیے اپنی مادری زبانوں پر یہاں کی مقامی زبانوں کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ اردوئے قدیم کے نمونے ہمیں انہی حضرات کے ملفوظات' مکتوبات اور تبرکات میں ملتے ہیں۔ اس زبان کو انہوں نے ذریعۂ اظہار کے طور پر اپنایا۔ ان کی اپنی علمی تصانیف عربی اور فارسی ہی میں ملتی ہیں۔

ملفوظات جن روحانی شخصیات کے ارشادات' احوال اور اقوال پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کی ہستیوں کا ایک اور فیض یہ بھی ہے کہ ان تحاریر کے باعث ہم آج بھی اس دور کے سیاسی' سماجی اور معاشرتی حالات کو جان سکتے ہیں۔ صوفیا کے ملفوظات پر مبنی یہ تصانیف جس دور سے تعلق رکھتی ہیں اُس دور کی مستند تواریخ موجود نہیں۔ مورخین نے آثارِ قدیمہ کی مدد سے جو تواریخ مرتب کیں۔ وہ مکمل معاشرے کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ہندو مت (جو اکثریت کا مذہب تھا) کے زیرِ اثر دُنیا کو کم تر اور عارضی ہونے کا فلسفہ رائج تھا۔ مذہب' تعلیم اور تجارت پر معاشرے کا اعلیٰ طبقہ براجمان تھا۔ جنہوں نے مذہبی رجحانات کے تحت تاریخ کو کوئی اہمیت نہ دی اور نہ ہی اس کو مرتب کرنے کا کوئی اہتمام کیا۔ ہندومت کی مذہبی تصانیف رگ وید' رامائن اور مہا بھارت وغیرہ میں چند تاریخی شواہد کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسے بیانات یا شہادتیں موجود نہیں جو اس قدیم دور تک ہماری رہنمائی کریں۔

صوفیاء کرام اسلام کا نورِ ہدایت اس خطے میں لے کر آئے۔ اُن کی خدمات کی وجہ سے افرادِ معاشرہ نہ صرف روحانی طور پر مستفید ہوئے بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی ترقی کی نئی راہیں کھلیں۔ جب یہاں تواریخ لکھنے کا اہتمام کیا بھی گیا تو حکمرانوں کے تحت متعصّبانہ تواریخ لکھی گئیں۔ ان ملفوظات میں بہت سے ایسے حقائق موجود ہیں جو روایتی تواریخ میں موجود حقائق کی تائید یا تردید کرتے ہیں۔ یہ تصانیف کسی کے حکم پر نہیں لکھی گئیں۔ اس لیے اس میں کسی خاص طبقے کی حمایت کا احتمال نہیں۔ اِن کی صداقت مستند ہے۔ پروفیسر محمد اسلم کہتے ہیں:

> ''ان ملفوظات کے مطالعے سے تاریخ کے کئی اہم گوشے ہمارے سامنے آئے۔ راقم کی یہ دیانت دارانہ رائے ہے کہ اگر اسلامی ہند کی تاریخ مرتب کرتے وقت اِن ملفوظات سے استفادہ کیا جاتا تو آج ہماری تاریخ اُس تاریخ سے جو ہمارے نصاب میں شامل ہے بالکل مختلف ہوتی۔''[۴]

پروفیسر خلیق نظامی نے بہت پہلے ان ملفوظات کی طرف توجہ دلائی کہ ملفوظاتی ادب ہندوستان کی تہذیبی وفکری تاریخ کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس سے نہ صرف صوفیا کی زندگی اور ان کے افکار ونظریات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس دور کی ذہنی فضا' معاشی حالات' ادبی تحریکات اور سماجی رجحانات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

وسطی صدیوں کے مورخین فارس کے نظریات کے تحت صرف بادشاہوں اور اہم مہمات کو ہی تاریخ کا حصہ بنانا ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں لکھی جانے والی تواریخ میں افراد معاشرہ کا وجود دکھائی نہیں دیتا۔ برصغیر میں بہت سے محققین نے تصوف اور تاریخ تصوف کی مَد میں گرانقدر اضافے کیے ہیں۔ ملفوظات کا گہرا مطالعہ اس دور کے سماجی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات و واقعات کا بھی مظہر ہے۔ نثار احمد فاروقی کہتے ہیں:

> ''ممتاز صوفیا اور اُن کے خلفاء کے بارے میں قدیم ترین ماخذ ''سیر الاولیاء'' ہے۔ اس میں تصوف' تاریخ تصوف اور ہندوستانی معاشرت کی تاریخ کے طالب علم کے لیے جتنا متنوع مستند اور مفصل مواد موجود ہے۔ اتنا اس عہد کی کسی کتاب میں نہیں۔''[۵]

برصغیر میں اُردو کی فکری روایت کی تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کی اکثریت کسی یکساں نظام فکر سے منسلک ہو جاتی ہے تو کوئی ذی شعور اس کی اہمیت اور اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ملفوظاتی ادب جہاں اردو کی ابتدائی دور کا بیان ہے۔ وہاں یہ اس دور کے کئی تاریخی بیانات کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ درباروں کے بجائے فقیروں کی خانقاہوں میں پروان چڑھنے والی اردو زبان آہستہ آہستہ ادبی حلقوں میں بھی استعمال ہونے لگی تھی۔ کیوں کہ صوفیا کی برکت سے اس زبان کو عوام میں بھی پذیرائی حاصل ہو رہی تھی۔ میر حسن سجزی سے بزرگوں کے اقوال کو جمع کرنے کی جو روایت شروع ہوئی۔ اس نے اس زبان کو مرکز نگاہ بنایا۔ ان ملفوظات کے باعث نہ صرف ادبی سطح کا سرمایہ دستیاب ہوا بلکہ ان میں تاریخ کا بہت سا حصہ بھی جمع ہو گیا۔ امیر خورد سلطان نظام الدین اولیا کے مرید خاص تھے۔ اپنے پیرومرشد کے اقوال کو ''سیر الاولیا'' میں جمع کیا۔ ان کے دادا سید محمد کرمانی فریدالدین گنج شکرؒ کے مرید خاص تھے۔ وہ اٹھارہ سال ان کی مریدی میں رہے۔ بقول امیر خورد ان کی (مصنف کی) پیدائش پر حضرت فریدالدینؒ نے ان کا نام تجویز کیا۔ اپنے بزرگوں کی زبانی سنے گئے اقوال اور بیعت کے بعد سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر رہ کر جو کچھ انہوں نے حاصل کیا۔ اس کو ''سیر الاولیا'' میں جمع کیا۔ برصغیر میں تصوف کی تاریخ اس تصنیف کے بغیر نامکمل رہتی۔ تصوف کی تاریخ کے علاوہ اس میں بہت سے تاریخی واقعات بھی موجود ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش بیس بیٹوں کا باپ تھا۔ اس کے باوجود اس نے عنان حکومت اپنی باصلاحیت بیٹی رضیہ سلطان کو تھمانا مناسب سمجھا۔ بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے پانچ بیٹے تھے مگر وہ اپنی بیٹی بی بی شریفہ کی پاکبازی اور پاک دامنی کی زیادہ تعریف کرتے تھے۔ ''سیر الاولیا'' میں مرقوم ہے کہ جب رضیہ سلطان تخت نشین ہوئی تو سینکڑوں جید علماء دہلی میں موجود تھے مگر کسی نے عورت کی حکمرانی کے خلاف فتویٰ نہیں دیا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عورت کی حکمرانی خلافِ شرع نہیں ہے۔ تاریخ کا ایک اور اہم واقعہ دوسرے کئی واقعات کی طرح ''سیر الاولیا'' میں مرقوم ہے۔

ناصر الدین قباچہ ملتان کا حاکم تھا۔ سلطان شمس الدین دہلی میں تھا۔ دونوں حکمرانوں میں اختلاف ہو گیا۔ مذہبی حلقوں کا رجحان شمس الدین کی طرف تھا۔ شیخ بہاؤالدین زکریا اور ملتان کے قاضی نے سلطان شمس الدین کو خطوط لکھے کہ وہ ملتان پر قبضہ کر لے۔ وہ دونوں خطوط قباچہ کے ہاتھ لگ گئے۔ قاضی کو تو اس نے فوراً قتل کروا دیا اور شیخ صاحب کو محل میں طلب کر لیا۔ قباچہ نے خط ان کے ہاتھ میں دے کر پوچھا کہ یہ خط کس کا ہے؟ شیخ صاحب نے جواب دیا۔ یہ میرا خط ہے اور میں نے اللہ کے حکم سے لکھا ہے۔ ولی اللہ کی طمانیت اور سکون دیکھ کر وہ ہیبت کا شکار ہو گیا اور اس کا غصہ جاتا رہا۔ چنانچہ وہ شیخ کا کچھ بھی نہ

بگاڑ سکا۔ اس موقع پر شیخ نے فرمایا کہ ''بعض لوگوں کا مزاج جلد متغیر ہو جاتا ہے۔''

ایسے واقعات سے حکمرانوں کی اصل شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ روایتی تاریخ نگاری میں اہم واقعات اور احکامات کو جگہ دی جاتی ہے۔ مگر بعض اوقات مورخین مقتدر اعلیٰ کی شخصیت کا اندازہ کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں جیسا کہ مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے علاؤالدین خلجی کے بارے میں لکھا کہ وہ بڑا بے دین بادشاہ تھا۔ احکام شریعت کی پابندی نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ نبی ہونے کا دعویٰ کرنے والا تھا۔

مگر جب ہم ''ملفوظات'' کے حوالے سے علاؤالدین خلجی کی شخصیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے بالکل متضاد ہے۔ علائی دور میں حضرت برہان الدین غریبؒ چراغ دہلی تھے۔ ان کے اقوال و ارشادات پر مبنی ملفوظات حمید قلندر نے ''خیر المجالس'' کے نام سے ترتیب دیئے۔ جس میں چراغ دہلی نے علاؤ الدین خلجی کو بندۂ خدا کہا ہے۔ جو مخلوق کا بہت زیادہ خیال رکھنے والا تھا۔ منگول حملے کے اندیشے کے پیش نظر اس نے خود بار برداری کے لیے عوام کو جانور مہیا کیے اور شہر کے مضافات میں بسنے والے لوگوں کو محفوظ پناہ گاہوں میں منتقل کروایا۔ اکثر مؤرخین نے علائی دور میں اشیائے صرف کی گرانی کا ذکر کیا ہے۔ مگر پروفیسر محمد اسلم ''خیر المجالس'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ علاؤ الدین خلجی نے چراغ دہلی کے سامنے تذکرہ کیا۔

> ''میں نے یہ سوچا ہے کہ اناج سستا کردوں۔ جس سے عوام کو فائدہ پہنچے اناج سستا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میں ایک حکم جاری کروں اور تمام نانکوں اور اناج لانے والوں کو بلاؤں۔ میں انہیں کپڑے اور گھروں کا خرچ دوں اور وہ اطراف و جوانب سے غلّہ لا کر میرے مقرر کردہ بھاؤ پر فروخت کریں۔''[۶]

چنانچہ اس تجویز پر عمل کرنے سے نہ صرف اناج بلکہ دوسری اشیائے صرف بھی سستی ہوگئیں۔ خیر المجالس میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ نے یہ واقعہ حاضرین محفل کو سنایا اور فرمایا: ''کیا بادشاہ تھا علاؤ الدین' اللہ کی رحمت ہو اس پر'' (ایضاً)

اگرچہ مؤرخین نے علاؤ الدین خلجی کی معاشی اصلاحات کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ ''فیروز شاہی'' از ضیاء الدین برنی میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے مگر سلطان کے ذہنی محرکات اور اس کی اصل شخصیت کا اندازہ ''خیر المجالس'' سے ہی ہوتا ہے۔ ''جوامع الکلم'' میں عوام کے حوالے سے کئی معلومات موجود ہیں۔ ان ملفوظات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بیماریاں اور وبائیں بہت زیادہ تھیں۔ خاص طور پر غریب طبقے کے لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ جس میں تپ دق کا بھی ذکر ہے۔

> ''ایک موقع پر حضرت گیسو دراز اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دہلی میں ایسی وبا پھوٹی کہ غسال مُردوں کو غسل دیتے دیتے تھک جاتے تھے اور انہیں مُردوں کے اتنے کپڑے اور استعمال کی چیزیں اور چارپائیاں ملتی تھیں کہ انہوں نے بالآخر تنگ آ کر اُنہیں ہاتھ لگانا ہی چھوڑ دیا تھا۔''[۷]

انہی ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ اُس دور میں دہلی میں غلاموں اور کنیزوں کی باقاعدہ خرید و فروخت جاری تھی۔ اُس کے کئی مراکز تھے۔ اُس دور کے سلطان فیروز تغلق نے جو اصلاحات نافذ کیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مالک صرف ان لونڈیوں سے اولاد پیدا کریں جو اُن کی زوجیت میں آئیں۔

''جوامع الکلم'' میں کئی جگہوں پر یہ ذکر ہے کہ سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں اس علاقے میں جوگیوں کا بڑا عمل دخل

تھا۔ لوگوں کو تعویذ گنڈوں اور جادو ٹونے کی طرف مائل کر کے لوٹتے تھے۔ اِن ملفوظات میں حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت نظام الدین اولیاء پر بھی جادو ہونے کی شہادت ملتی ہے۔

ضیاء الدین برنی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں لکھتا ہے کہ غیاث الدین بلبن کے دور میں میواتیوں کے گروہ شہر کے قریبی جنگلات میں چھپے رہتے تھے۔ جیسے ہی شام کا اندھیرا پھیلنے لگتا وہ باہر نکل آتے اور آنے جانے والوں سے لوٹ مار کرتے۔ بلبن نے ان کی سرکوبی کا اہتمام کیا اور اہلیانِ دہلی کو اِس فتنے سے نجات دلائی۔

جب کہ ''جوامع الکلم'' میں یہ حقیقت مرقوم ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے دور میں بھی میواتی اُسی طرح سرگرم تھے اور لوگ ان کے خوف سے نمازِ مغرب سے پہلے پہلے شہر میں داخل ہو جاتے تھے۔ یعنی امن و امان کی صورتِ حال اتنی بہتر نہ تھی جتنی بیان کی گئی ہے۔ حضرت برہان الدین غریب کے ملفوظات اس سے پہلے ''احسن الاقوال'' کے نام سے مرتب کیے گئے۔ اُس میں پنجاب کی امن و امان کی صورت حال خراب بتائی گئی ہے۔ اِس کے علاوہ دہلی کے میواتیوں کی لوٹ مار کا ذکر بھی موجود ہے۔

صوفیا نے جہاں افرادِ معاشرہ کو قلب و نظر کی انفرادی ترفع کا درس دیا وہیں انہوں نے مجموعی طور پر سماج کو فاسد عناصر سے پاک کرنے کی بھی تلقین کی۔ اس میں روزمرہ کے آپس کے معمولی معاملات سے لے کر شادی بیاہ رسم و رواج تک شامل ہیں۔ یعنی ان بندگان خدا نے سماج میں پنپنے والے انسانیت دشمن عناصر کی حوصلہ شکنی کی۔ ان میں دنیا طلبی اور جاہ پرستی نہ تھی۔ اکثر مورخین نے سلاطین کے ساتھ ان بزرگوں کے ایسے تعلقات بیان کیے ہیں کہ وہ جو چاہتے ان سے طلب کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنی خانقاہوں سے روحانی فیض ہی دیا' لوگوں سے لیا کچھ نہیں۔ اپنے کردار کو مثالی بنایا۔ ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی جیسی سماجی برائیاں اس وقت بھی موجود تھیں۔ صوفیا نے ان کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ اپنے مریدین کو ان سے دور رہنے کی تلقین کی۔ اللہ تعالیٰ نے جن کو زمین کی حکمرانی بخشی وہ لوگ بھی لالچ جیسی بلا سے نہ بچ سکے۔

گجرات کا سلطان بہادر شاہ' چتوڑ کے مقام پر ہندوؤں سے برسرِ پیکار تھا۔ مسلمانوں کی خواہش تھی کہ اسے فتح نصیب ہو مگر ہندو راجپوتوں نے ہمایوں کو لالچ دے کر اُسے گجرات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان بہادر شاہ کو اپنی مملکت بچانے کے لیے چتوڑ کا محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ ہمایوں کی اس حرص اور طمع کو اس وقت کے مذہبی حلقوں میں سخت ناپسند کیا گیا۔ روایتی تواریخ میں اس ناراضگی کی وجوہات بیان نہیں کی گئیں۔ مگر شیخ رُکن الدینؒ کے ملفوظات ''لطائف قدسی'' میں ان اسرار کو بیان کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ احمد کھٹوؒ امیر تیمور کے دور کے صوفی تھے۔ ان کے ملفوظات محمود بن سعد ابرجی نے ''تحفۃ المجالس'' کے عنوان سے مرتب کیے۔ وہ بچپن میں کسی سخت آندھی طوفان کے دوران اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئے تھے۔ بابا اسحاقؒ نے جو اپنے وقت کے درویش تھے' اُن کو پالا پوسا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق بابا اسحٰق سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ جس کا ذکر ان ملفوظات میں موجود ہے۔ امیر تیمور کے دور کا ایک تاریخی واقعہ بھی شیخ احمد سے منسوب ہے۔ جس کو اس تصنیف میں بیان کیا گیا ہے۔ سلطان دہلی کی طرف آتے ہوئے پنجاب اور راستے میں آنے والے دیگر علاقوں کی فصلیں اُجاڑتا ہوا آگے بڑھا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اس کا اثر قحط کی صورت میں رونما ہوا۔ اس کے علاوہ وہ بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کر ساتھ لے آیا تھا۔ ایک دن اسے

اطلاع ملی کہ قید خانے میں ہر گروہ میں سے کچھ قیدی کم ہیں۔ اس پر وہ خود قید خانے کے معائنے کے لیے آیا تو اس نے دیکھا کہ نہ صرف قیدیوں کی تعداد پوری ہے بلکہ ان کی صحت بھی بہت اچھی ہو رہی ہے۔ اس نے قیدیوں سے سوال کیا کہ ان کو کھانے کو کیا اور کہاں سے ملتا ہے۔ انہوں نے شیخ احمد کھٹوؒ کا نام لیا کہ وہ انہیں روزانہ تازہ کھانا بہم پہنچاتے ہیں۔ امیر تیمور پر آپؒ کی کرامت ظاہر ہو چکی تھی۔ وہ تائب ہوا۔ آپؒ کو رہا کیا اور آپؒ کے حکم سے ہزاروں قیدیوں کو بھی رہا کر دیا۔ مؤرخ گجرات Commisariat نے اِس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ ہمارے مؤرخین نے دورِ حاضر میں عہد سلاطین کی تاریخ لکھتے وقت شیخ احمد کھٹوؒ کے اس عظیم کارنامے کا ذکر نہیں کیا۔ شیخ موصوف کی دوسری خدمات سے قطع نظر ہزاروں قیدیوں کی رہائی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے تاریخ کے صفحات میں مناسب جگہ ملنی چاہیے۔

امیر حسن علاء سجزی نے نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کو ''فوائد الفوائد'' میں جمع کیا۔ شریعت اور طریقت کے احکامات کے ساتھ ساتھ بہت سی دوسری روایات بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ لاہور سے کچھ تاجر گجرات آئے انہوں نے اپنے مال کے دام بہت بڑھا چڑھا کر لگائے مگر چُکتے چُکتے بہت کم میں سودا چُک گیا۔ مقامی لوگوں نے استفسار کیا کہ کیا تمہارے شہر میں مال بیچنے کا یہی طریقہ ہے؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ شہر آباد ہے۔ جواب ملا ہاں۔ پوچھنے والے نے کہا کہ جس شہر میں سوداایسے کیا جاتا ہو اُسے آباد تو نہیں رہنا چاہیے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ ابھی تاجر اپنا مال بیچ کر لاہور واپس نہ پہنچے تھے کہ منگولوں نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ شہر کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ منگولوں نے ۲۷ اپریل ۱۲۴۶ء میں لاہور کو فتح کیا۔ اسی روز حضرت پیرزکی اور حضرت پیر صلاح الدین ابوالمجاہد بھی شہید ہوئے۔ کوئی مورخ منگولوں کے حملے کا رشتہ تاجروں کے سودے بازی کرنے سے نہیں جوڑے گا۔ اس کی نظر میں اسباب وعلل دوسرے ہی ہوں گے لیکن ایک صوفی کی نظر معاشرے کے اعمال اور اُن سے پیدا شدہ اثرات پر بھی ہوتی ہے۔ جن لوگوں میں دھوکہ دہی اور زیادہ منافع خوری کی ہوس موجود ہو وہ یقیناً عذابِ الٰہی کا شکار ہوں گے۔

اس واقعے کے بیان سے یہ بھی مقصود ہے کہ صوفیا کی ان تعلیمات کو دیکھا جائے جو انسانی اقدار کی آفاقیت پر مشتمل تھیں۔ یعنی انسانی معاشروں میں مذہب، رنگ، نسل غرض ہر ایک چیز فرق ہو سکتی ہے مگر انسانی اخلاقی اقدار تمام انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے دنیا کی طلب اور جاہ پرستی کی حوصلہ شکنی کی۔ اپنے حلقے میں بیٹھنے والوں کو قناعت، توکل، عزتِ نفس، طلبِ رضائے الٰہی اور خاکساری کا درس دیا۔ ہر تعلیم اور ہر تربیت کا بنیادی سبق انہی اقدار کی ترویج ہونا چاہیے۔ اس لیے ملفوظاتی ادب آج پہلے سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کیوں کہ آج ان اقدار کو فروغ دینے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ ان ملفوظات کے بارے میں خلیق احمد نظامی کہتے ہیں:

> ''صوفیا کرام نے سماج کے صحت مند عناصر کو اُبھارنے اور اخلاقی قدروں کی فضیلت دل نشین کرنے کے سلسلہ میں جو جدوجہد کی تھی، اس کی تفصیلات ملفوظات میں ہی ملتی ہے۔''[۸]

ان تمام مثالوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ برصغیر کی تاریخ نویسی کسی بھی پہلو (تمدنی، تخلیقی عرفانی) کو مدنظر رکھ کر لکھی جائے، کوئی بھی ذی فہم مؤرخ ان ملفوظات کو صرفِ نظر کر کے تاریخ کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ملفوظات کے مزید مطالعے اور تحقیق کی طرف توجہ دی جائے۔ برعظیم میں اِن صوفیا نے بغیر تخصیص رنگ و نسل، مقام و مرتب

ہر خاص و عام کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے۔ دلوں کو ہدایت کا نور بخشا تو سماج کو بھی مثبت روایات اور اقدار کا امین بننے کے قابل بنایا۔اُردو ادب میں اِن ملفوظات کو صنف ادب کی حیثیت اس لیے حاصل ہے کہ یہ اردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے اہم ہیں۔ زبان کی تاریخ میں یہ ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والی صنف ہے۔ لسانی تحقیق کے ماہرین کے لیے ان میں زبان کی پیدائش کے وقت کے نمونے موجود ہیں۔

اِن ملفوظات کے ساتھ ہندوستان میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت کی تاریخ جڑی ہوئی ہے۔صوفیا کی آمد اور مسلم فاتحین کی آمد تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً ایک ہی عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ دونوں طبقے نو وارد تھے۔ ایک طبقے نے بزورِ شمشیر لوگوں پر حکومت کی، مگر دوسرے طبقے نے تعلیماتِ الٰہی کا درس دے کر مقامی لوگوں کے دلوں پر اپنا تسلط قائم کیا۔ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق میں بھی رہے۔ ان سلاطین کی سوانح عمریاں، تواریخ اور ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ ہر مسلم حکمران کسی نہ کسی ولی وقت کا مرید رہا۔ مرشد اپنے عقیدت مندوں کو دین اور دُنیا دونوں کی تعلیم دیتے۔ وہ بادشاہِ وقت کے ساتھ ساتھ عوام کی حالت سے بھی بخوبی باخبر رہے۔ اسلامی تصوف کی اِس روایت نے جہاں روحانی فلاح کے لیے سعی کی وہاں تاریخی مناظر میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

حوالہ جات:

۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، (مرتب)، تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاک و ہند، ص: ۱۱۷
۲۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، ص: ۳۸
۳۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، ص: ۲۷
۴۔ محمد اسلم، پروفیسر، ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت، ص: ۱۰
۵۔ نثار احمد فاروقی، نقد ملفوظات، ص: ۲۱۰
۶۔ محمد اسلم، پروفیسر، ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت، ص: ۱۳۰
۷۔ ایضاً، ص: ۱۰۰
۸۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رُجحانات، ص: ۱۰۶

II